سلسلہ مطبوعات (۲۰)

فاضل بریلوی کے
معاشی نکات
جدید معاشیات کے آئینے میں

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی
ایم۔اے، ایم۔ایس (کوئنز یونیورسٹی کینیڈا)

مرکزی مجلس رضا۔ لاہور

سلسلہ مطبوعات ۲۰

فاضل بریلوی کے
معاشی نکات
جدید معاشیات کے آئینے میں

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی
(ایم۔اے، ایم۔ایس دکونز یونی ورسٹی کینیڈا)

مرکزی مجلس رضا — لاہور

کتاب ــــــــــ فاضل بریلوی کے معاشی نکات
جدید معاشیات کے آئینے میں
مولف ــــــــــ پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی
کتابت ــــــــــ ادارہ پروینِ کتابت لاہور
مطبع ــــــــــ ملی پرنٹرز ۹ سرکلر روڈ۔ لاہور
طابع ــــــــــ ایم منیر قاضی
ناشر ــــــــــ مرکزی مجلس رضا۔ لاہور
قیمت : دعائے خیر بحق معاونین مجلس رضا
بار اوّل ــــــــــ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ۔ اگست ۱۹۷۷ء

ملنے کا پتا
مرکزی مجلس رضا۔ نوری مسجد۔ بالمقابل ریلوے اسٹیشن۔ لاہور

نوٹ : بیرونجات کے حضرات بیس پیسے کے ٹکٹ بھیجکر طلب فرمائیں۔

تعارفِ مؤلّف

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی یکم مارچ ۱۹۳۴ء کو مراد آباد (بھارت) میں پیدا ہوئے، انہوں نے لکھنؤ، لاہور اور کنیڈا میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان کے اساتذہ میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں:

۱۔ علامہ تاجور نجیب آبادی

۲۔ پروفیسر اشفاق احمد

۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

۴۔ پروفیسر سید وقار عظیم

۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۶۔ صوفی غلام مصطفٰے تبسم

۷۔ ڈاکٹر عبداللہ،

۸۔ ڈاکٹر اختر

بیرونی ممالک کے اساتذہ میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں:

۱۔ پروفیسر ارک ہارٹ (URQUEHART)

۲۔ ڈاکٹر سلیٹر (SLATER)

۳۔ ڈاکٹر اسمتھ (SMITH)

۴۔ ڈاکٹر ڈین اشر (DANE USHER)

۵۔ پروفیسر ایچیسن (AICHESON)

پروفیسر رفیع اللہ صدیقی نے ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے ایم۔اے (معاشیات) کیا اور ۱۹۶۹ء میں کوئینز یونیورسٹی (کینیڈا) سے ایم۔ ایس (معاشیات) کیا۔ وہ تقریباً بیس سال سے معاشیات پڑھا رہے ہیں اور پاکستان کے ان چند اساتذہ میں سے ایک ہیں جو معاشیات کی جدید تدریسی تکنیک سے واقف ہیں۔

پروفیسر صدیقی ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء میں پاکستان فضائیہ سے بھی منسلک رہے اور موجودہ پاک فضائیہ کے سربراہ ایر مارشل ذوالفقار علی خاں سے پرواز کی تربیت حاصل کی۔ لیکن کاتب تقدیر نے علمی فضاؤں میں پرواز لکھی تھی اس لئے وہ فضائیہ کو خیرباد کہہ کر علمی دنیا میں آگئے اور بندگانِ خدا کی زندگی کا سامان بن گئے۔

پیش لفظ

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت، مجدد دین و ملت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ موجودہ صدی کی وہ عبقری شخصیت ہیں جن کا مکمل تعارف وہی کرا سکتا ہے جو اُن جیسا جامع العلوم ہو۔ کسی فن کا ماہر جب انہیں اُس فن میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ جناب رفیع اللہ صدیقی پروفیسر معاشیات نے جب آپ کے پیش کردہ معاشی نکات پڑھے تو انہوں نے دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ موجودہ صدی کا ربع اول وہ بلاخیز دور تھا کہ بڑے بڑے علماء اور لیڈر ثابت قدم نہ رہ سکے ایسے وقت میں اعلیٰ حضرت بریلوی نے "تدبیر فلاح و نجات و اصلاح" کے نام سے امت مسلمہ کی معاشی بہبود کی خاطر چار تجاویز پیش کی تھیں جو آج بھی اپنے اندر وزن رکھتی ہیں اور امام احمد رضا بریلوی کی ژرف نگاہی کی شاہد ہیں۔ پیشِ نظر مقالہ میں ان ہی تجاویز پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کا معاشی نظریہ ایک سچے مسلمان کی طرح وہی تھا جسے "نظامِ مصطفےٰ" (صلے اللہ علیہ وسلم) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ارشاداتِ الٰہیہ ہماری راہنمائی کرتے ہیں کہ چوپایوں کی طرح ہمارا مقصد زندگی محض کھانا پینا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اجل مجدہٗ کی اطاعت ہے۔ عقائد ہوں یا اعمال، معاشیات ہوں یا سیاسیات ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ناگزیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر نہیں ہو سکتی، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کی تعلیمات کا حاصل ہی یہ تھا کہ دامنِ مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے وابستہ ہو کر طاعتِ الٰہی اختیار کرو

فکر معاش سے آزاد ہو جاؤ نگے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الزخرف رکوع ۳) ہم نے ان میں ان کی زیست کا سامان دنیا کی زندگی میں بانٹا وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود رکوع ۱) اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔ (کنز الایمان)

موجودہ صدی کے آغاز میں یہ مسئلہ موضوع بحث بنا رہا کہ ہندوستان دار الاسلام ہے یا دار الحرب[1]؟ علماء کے ایک گروہ نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا اور اس بنا پر (۱) مسلمانوں کے لئے ہندوستان سے ہجرت لازم قرار دی (۲) ہندوستان میں کفار سے سودی کاروبار جائز قرار دیا۔

تحریک ہجرت بڑے زور شور سے چلی۔ ہزاروں افراد اپنی جائدادیں برائے نام قیمت پر فروخت کر کے افغانستان چلے گئے وہاں اتنی گنجائش کہاں تھی' واپس آئے تو پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

سُود ایک ایسی لعنت ہے جو افلاس اور بدحالی کی راہ دکھاتا ہے، سود احترام انسانیت ختم کر دیتا ہے اور جب سود در سود کا چکر چلتا ہے تو آدمی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مسلمان پہلے ہی ہندوؤں کے سودی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس فتوے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

اعلیٰحضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دار الاسلام ہے اگر اس فتوے کو پیش نظر رکھا جاتا تو ہجرت کے سبب پیش آنے والی معاشی تباہی نہ آتی اور نہ ہی قوم سود کے چکر میں مبتلا ہو کر معاشی ابتری کا شکار ہوتی۔

---

[1] اس مسئلے کی تحقیق کے لئے رسالہ "دو اہم فتوے" شائع کردہ مکتبہ قادریہ۔ جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ، لاہور۔ ملاحظہ کیا جائے۔ (ادارہ)

محسن ملت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" میں ایسی تدبیریں بیان فرمائی ہیں جن سے سودی کاروبار کئے بغیر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

گداگری ایسی آفت ہے جو قومی جسم میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتی ہے یہ نہ صرف ذہنی انحطاط کی انتہا ہے بلکہ پوری قوم کے لئے ایک عظیم المیہ ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے رسالہ مبارکہ "خیر الآمال فی حکم الکسب والسوال" میں مانگنے کی بھرپور مذمت بیان فرما کر محنت مزدوری اور کسب معاش کے دیگر ذرائع کی اہمیت بیان فرمائی جس سے انفرادی اور اجتماعی معاشی خوش حالی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

کاش! اہل سنت کے ارباب قلم ذرائع ابلاغ کی اہمیت محسوس کرتے اور اعلیٰ حضرت و دیگر علماء اہل سنت کی قابل قدر خدمات کو منظر عام پر لاتے وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز۔

زیر نظر کتابچہ "مرکزی مجلس رضا لاہور" طبع کروا کر بلا قیمت شائع کر رہی ہے۔ اس سے قبل مجلس ہذا اعلیٰ حضرت سے متعلق متعدد رسائل و کتب چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ اراکین ادارہ اور معاونین ادارہ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

محمد عبد الحکیم شرف قادری

لاہور

یکم رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاضل بریلوی کے معاشی نکات

جدید معاشیات کے آئینہ میں

پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی (ایم۔اے، ایم۔ایس (کوئنز یونیورسٹی، کینیڈا)

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے مولانا احمد رضا خان بریلوی پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ اپنی تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب کی دور رس نگاہیں مولانا احمد رضا خاں کے ان نکات کی طرف مرتکز ہو گئیں جو انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی و معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لئے اپنے رسالے "تدبیر فلاح و نجات و اصلاح" میں تحریر فرمائے اور جو ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ کلکتہ سے شائع ہوئے۔ ان نکات کی تفصیل یہ ہے :۔

۱ــــ ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے، مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں پس انداز ہو سکیں۔

۲ــــ بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے بینک کھولیں۔

۳ــــ مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔

۴۔ علم دین کی ترویج و اشاعت کریں۔

یہ چار نکات بظاہر بےحد مختصر ہیں لیکن ان میں معانی کا جو ذخیرہ پوشیدہ ہے اس کے اظہار کے لئے ڈاکٹر صاحب نے مجھے منتخب فرمایا ہے کہ میں بحیثیت معاشیات کے طالب علم ان نکات کی وضاحت کروں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اگرچہ گذشتہ بیس سال سے معاشیات پر درس دے رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنے احساسات کو قلمبند کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ پھر بھی میں نے ارادہ کیا ہے کہ ان نکات کی وضاحت کرنے کی پوری پوری کوشش کروں۔

علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

بلاشبہ مومن کے اشارے ہیں اور مومن بھی کیسا مومن کہ جس کی ہر سانس عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معطر تھی۔ ان اشاروں میں جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ان نکات پر بحث کروں، بطور تمہید کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ یہ نکات شائع ہوئے برصغیر میں علم اقتصادیات کا مطالعہ عام نہیں تھا۔ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلینڈ، امریکہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دانشوروں کا ایک مخصوص حلقہ اس علم کے اکتساب کی طرف مائل تھا۔ معاشیات پر باقاعدہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن عوام کی توجہ اور دلچسپی اس مضمون کے متعلق بہت کم تھی۔ طلباء اس مضمون کو خشک سمجھ کر اس سے گریز کرتے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور خاص طور پر ۳۰-۱۹۲۹ء کی عظیم عالمی سرد بازاری کے بعد

معاشیات کی اہمیت میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ امریکہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں معاشیات کے طلباء کی تعداد بہت کم تھی ۔ خواتین خصوصاً یہ مضمون پڑھنے سے کتراتی تھیں، لیکن ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد حالات یک لخت بدل گئے اور معاشیات کے طلباء کی تعداد میں بے اندازہ اضافہ ہوا ——— اور اب تو امریکی ماہرین تعلیم اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ پرائمری سطح ہی سے طلباء کو معاشیات کی تعلیم دی جائے۔

بہرحال یہ امر واقع ہے کہ علم اقتصادیات میں عوام اور حکومتوں کی دلچسپی کا آغاز ۳۰-۱۹۲۹ء کی عالمی سرد بازاری کی وجہ سے ہوا۔ کساد بازاری کو قابو میں لانے کے لئے کلاسیکی نظریات موجود تھے، لیکن اس عظیم عالمی کساد بازاری نے ان نظریات کو باطل کر دیا اور اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ ایک ایسے نئے نظریہ کی ضرورت ہے جو اس کساد بازاری پر قابو پانے میں مدد دے سکے، بالآخر ۱۹۳۶ء میں ایک انگریز ماہر اقتصادیات جے ایم کینز (J. M. Keynes) نے اپنا مشہور زمانہ "نظریہ روزگار و آمدنی" پیش کیا جو اقتصادیات کے میدان میں ایک انقلاب کا سبب بنا۔ اس انقلابی نظریہ نے حکومتوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اس عالمی سرد بازاری پر مکمل قابو پالیں۔ کینز کو ان کی خدمات کے صلہ میں تاج برطانیہ نے لارڈ کے خطاب سے نوازا جو کسی بھی انگریز کے لئے اعلیٰ ترین خطاب ہے اور باعثِ افتخار۔

اس تمہید سے میری غرض صرف اتنی ہی ہے کہ ناظرین یہ ذہن نشین کر لیں کہ جدید اقتصادی نظریات کی ابتداء ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہی ہوئی اور یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ نگاہِ مردِ مومن نے ان جدید اقتصادی تقاضوں کی جھلک ۱۹۱۲ء ہی میں دکھادی تھی۔ اگر ۱۹۱۲ء سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نکات پر غور و فکر کیا

جاتا اور صاحب حیثیت مسلمانانِ ہند اس پر عمل کرتے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت معاشی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہوتی۔

آیئے اب ان نکات پر الگ الگ بحث کی جائے جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا بریلوی کے ان نکات کی تعداد چار ہے جس میں سے تین کا تعلق میرے نزدیک جدید اقتصادیات کی روح سے ہے اور چوتھا علم دین کی ترویج و اشاعت سے متعلق ہے

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے :-

"ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں پس انداز ہو سکیں۔"

اس نکتے میں اہم بات "پس اندازی" ہے۔ فضول خرچی کی مذمت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال قبل ہی کر دی تھی — جدید ماہرین اقتصادیات فضول خرچی کی بے حد مذمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر پیداواری کاموں پر کیے جانے والے اخراجات قطعاً غیر پیداواری حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر برصغیر کے مسلمانوں کی بیسویں صدی عیسوی میں پاکستان بننے سے پہلے تک کی اقتصادی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے باہمی مقدمہ بازیوں پر کروڑوں روپے ضائع کئے۔ یو۔پی میں تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں ۱۴ فیصد تھی لیکن اقلیت ہونے کے باوجود وہ ایک باعزت اور پروقار زندگی گزار رہے تھے۔ مسلمانوں کی اقتصادیات اور ان کی خوشحالی کا انحصار زمینداری پر تھا۔ یو۔پی میں مسلم نوابین، راجاؤں اور زمینداروں کی کمی نہ تھی۔ زمیندار اس صوبے میں وہ افراد ہوتے تھے جو کم از کم ایک گاؤں کے مالک ہوتے تھے — لیکن میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حضرات مقدمہ بازیوں میں پھنسے

رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مقدمہ بازی ان صاحبان کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ میرے ایک قریبی عزیز جو زمیندار تھے بارہ برس سے مسلسل ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہم زلف سے مقدمہ بازی کے سلسلہ میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل نے یو۔پی کے مسلمانوں کی معیشت پر زمینداری کا خاتمہ کر کے بھرپور وار کیا اور مسلمانوں کی اقتصادیات کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

فاضل بریلوی کے پہلے نکتے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ مقدمہ بازی پر کیے جانے والے اخراجات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس طرح مسلمان آپس میں مخالفت پر تلے رہتے تھے۔ دوسری اور اہم بات یہ تھی کہ یہ کروڑوں روپیہ جو مقدمہ بازی کی نذر ہو رہا تھا کاش کہ اگر بچایا جا سکتا تو مسلمانوں کے کس قدر کام آتا۔ یہ اخراجات قطعاً غیر ضروری تھے ۔۔۔ اگر مفاہمت اور سمجھ بوجھ سے کام لیا جاتا تو اکثر و بیشتر مقدمات کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی اور معاملات باہمی صلاح و مشورے سے طے ہو جاتے اور مسلمانوں کا سرمایہ غیروں کی تقویت کا باعث نہ بنتا۔

فاضل بریلوی نے ۱۹۱۲ء میں پس اندازی کی ہدایت فرمائی تھی کیونکہ انہیں احساس تھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کا یہی بہترین علاج ہے کہ وہ غیر ضروری اخراجات یکسر ختم کر دیں اور اس طرح جو کچھ پس انداز ہو وہ اپنی فلاح و بہبود پر صرف کریں۔ ۱۹۳۶ء میں کینز نے اپنا نظریہ "روزگار و آمدنی" پیش کر کے جدید اقتصادیات کی بنیاد مضبوط کی۔ اس کے نظریہ کی اہم ترین "مساوات" میں بچت اور سرمایہ کاری سب سے اہم متغیرات (Variables) ہیں

اس کے نزدیک معیشت میں اقتصادی توازن کے لئے یہ شرط ہے کہ

بچت = سرمایہ کاری

جب تک یہ شرط پوری ہوتی رہے گی سرمایہ دارانہ معیشت میں توازن برقرار رہے گا۔ لیکن جہاں ان دونوں میں عدم مساوات پیدا ہوئی معیشت کا توازن بگڑ جائے گا ــــــ یا تو معاشرہ کساد بازاری کا شکار ہو جائے گا یا افراطِ زر کا۔ دونوں ہی صورتیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے خطرناک ہیں۔ لہٰذا کوشش اس بات کی ضروری ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری میں توازن برقرار رہے۔ فرد یا افراد کے لئے یہ توازن لانا بے حد مشکل ہے۔ لہٰذا کینز نے حکومتوں کو مشورہ دیا کہ وہ معاشی افعال میں بھرپور حصہ لیں۔ اب تک ماہرین معاشیات حکومتوں کو چند ضروری شعبوں (مثلاً دفاع، پولیس، صحت، تعلیم اور ریل و رسائل وغیرہ) میں حصہ لینے کے علاوہ باقی شعبوں سے دور رہنے کی تجاویز دیتے تھے تاکہ معاشرہ میں فرد کی اقتصادی آزادی متاثر نہ ہو۔ حکومتیں اس پر عمل بھی کرتی تھیں لیکن ۱۹۲۹-۳۰ء کی عالمی کساد بازاری نے قدیم ماہرین معاشیات کے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا ــ اُدھر کینز کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ حکومتوں نے معیشت کے ہر شعبے میں بھرپور حصہ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو کساد بازاری سے نجات مل گئی اور کینز کو انگلینڈ کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا۔

موجودہ دور، اقتصادی منصوبہ بندی کا دور ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک ملک کی خوشحالی میں اضافہ کے باقاعدہ منصوبے بناتے ہیں۔ ان منصوبوں کی میعاد عموماً ۵ سال ہوتی ہے۔ انقلاب روس کے بعد کمیونسٹ ماہرین اقتصادیات نے روس کی معاشی ترقی کے لئے پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا۔ آج پسماندہ ممالک بھی اقتصادی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ روس کے بعد بیشتر ترقی پذیر ممالک میں پنجسالہ ترقیاتی منصوبوں کو مقبولیت بخشی ہے اور ان ممالک میں اقتصادیات کے

ماہرین ملکی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندیوں میں مشغول ہیں۔ جہاں اقتصادی منصوبہ بندی میں دیگر اور باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں ماہرین اس بات کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں کہ منصوبوں کی تکمیل کے لئے کن ذرائع سے رقم حاصل کی جا سکتی ہے۔ منصوبوں کے لئے رقم دو ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔

(۱) ملکی بچت اور (۲) قرضے

ملک میں اگر بچت کی شرح اونچی ہے تو ملکی ذرائع ہی سے منصوبوں پر عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن بچت کی شرح کم ہونے کی صورت میں حکومت کو غیر ملکی قرضوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ منصوبہ بندی کی تکمیل کے لئے ایک تیسرا طریقہ بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حسب ضرورت ملک کا مرکزی بینک نوٹ چھاپ چھاپ کر حکومت کے حوالے کرتا رہے۔ لیکن یہ طریقہ ارزاں ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خطرناک بھی ہے۔ اس سے ملک میں افراطِ زر آجاتا ہے اور اگر افراطِ زر پر حکومت جلد قابو نہ پا سکے تو پھر اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوتے ہیں اور معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

لہذا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ملک میں بچتوں کی ہمت افزائی کی جائے اور لوگوں کو بچت کرنے پر مجبور کیا جائے۔ پسماندہ ممالک میں بچت کی شرح بہت کم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں بچت کی اہلیت بہت کم ہے کیونکہ ان کی آمدنیاں بیحد قلیل ہیں۔ اگر افراد کی آمدنیوں میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا بھی ہے تو افراد اسے اشیائے صرف پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ بیشتر ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری کی شرح ۵ فیصد سے ۸ فیصد ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح ۱۵ فیصد سے ۱۸ فیصد ہے یعنی ترقی پذیر ممالک اپنی قومی آمدنی کا صرف ۵ سے ۸ فیصد حصہ سرمایہ کاری کے لئے خرچ کرتے ہیں جب کہ اقتصادی

ترقی کا تقاضا ہے کہ قومی آمدنی کا کم از کم ۱۵ فیصد سرمایہ کاری کے لئے وقف کر دیا جائے جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کینز کی مشہور زمانہ مساوات (Equation) کے مطابق

بچت = سرمایہ کاری۔

اگر بچتیں زیادہ ہیں تو سرمایہ کاری زیادہ ہوگی لیکن بچتیں اگر کم ہیں تو اقتصادی ترقی کی رفتار بیحد سست ہوگی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں۔ ایک امریکی ماہر اقتصادیات کولن کلارک (Collin Clark) نے بھارت، چین اور پاکستان کے لئے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں کے افراد کم از کم قومی آمدنی کا ۱۲ فیصد پس انداز کریں اور اسے سرمایہ کاری میں لگائیں۔ لہذا آج کل ہر ملک میں خواہ وہ پسماندہ ہو یا ترقی یافتہ، بچت میں اضافے کے لئے مختلف اسکیموں پر عمل کیا جاتا ہے۔ خود پاکستان میں ہماری حکومت نے ایسی بہت سی اسکیمیں رائج کر رکھی ہیں۔ جن سے چھوٹی چھوٹی بچتوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے ہمیں رقم کی ضرورت ہے اور اس رقم کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ملکی بچت کے ذریعہ ہے۔

اب اہلِ دل اور اہلِ نظر ذرا اس ماحول کو ذہن میں رکھیں جب کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا احمد رضا خاں نے مسلمانوں کو اس بات پر عمل کرنے کی تلقین کی تھی کہ وہ غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کریں اور زیادہ سے زیادہ پس انداز کریں اور آج کے ماحول پر نظر ڈالیں جب کہ حکومتیں اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ عوام زیادہ سے زیادہ بچت کریں ــــ کیا آپ اب بھی قائل نہ ہوں گے مولانا کی دور اندیشی کے ــــ کیا اب بھی آپ کو یقین نہ آئے گا کہ مولانا کی دور رس نگاہیں

مستقبل کو کتنا صاف دیکھ رہی تھیں ——— کینز کو اس کی خدمات کے
صلے میں اعلےٰ ترین خطاب مل سکتا ہے اس بنا پر کہ اس نے وہ چیز
دریافت کر لی تھی جسے چوبیس سال قبل مولانا احمد رضا خاں بریلوی شائع کروا چکے
تھے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس طرف ذرہ برابر توجہ نہ دی۔

(۲) اب آیئے دوسرے نکتے کی طرف مولانا نے فرمایا:۔

"بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد دکن
کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے بینک کھولیں"

یہ نکتہ معاشی نقطہ نظر سے اس قدر اہم ہے کہ ہمیں مولانا احمد رضا خاں
کی اقتصادی سوجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کے صرف
چند بڑے بڑے شہروں میں بینک قائم تھے جن کی ملکیت انگریزوں یا ہندوؤں کے
ہاتھوں میں تھی۔ برصغیر میں ۱۹۴۰ء تک کوئی مسلم بینک موجود نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء میں بنک
اور بنکوں کی اہمیت کا اندازہ لگا لینا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولانا کی نگاہوں
سے معاشیات کے مستقبل کے اس اہم ادارے کی اہمیت پوشیدہ نہ رہ سکی اور
انہوں نے مال دار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے لئے بنک قائم کریں۔

سود کی بے پناہ مضرت رسانیوں کے متعلق مولانا احمد رضا خاں نے اپنی دیگر
کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لہذا یہ امر یہاں واضح ہے کہ مولانا احمد رضا خاں
کی مراد ایسا بینک کاری نظام تھا جو غیر سودی بنیادوں پر استوار ہو۔

جدید اقتصادی ڈھانچے بینکنگ بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ایک مستحکم
بینکنگ نظام ملکی معیشت کو تازہ و صحت مند خون فراہم کرتا ہے۔ بنک وہ ادارے
ہیں جو لوگوں کی بچتوں کو پیداواری کاموں میں لگانے کا ذریعہ ہیں۔ آج کا معاشی نظام
بغیر بنکنگ کے عضو معطل ہو کر رہ جائے گا۔ اسی وجہ سے موجودہ اقتصادی نظام کو

ایک (Compound Interest System) کہا جاتا ہے یعنی ایک
ایسا نظام جس کی بنیاد سود مرکب پر ہے۔ ایسے نظام میں بنکوں کی اہمیت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اقتصادی منصوبہ بندی میں سرمایہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی بھی
اقتصادی منصوبہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو بغیر سرمایہ کے تکمیل
کے مراحل طے نہیں کر سکتا۔ اقتصادی ترقیاتی منصوبوں میں بنکوں کے سپرد یہ اہم
کام ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ کی قلت کو دور کریں اور بچت اور سرمایہ کاری کی ہمت
افزائی کریں۔ ایک مضبوط بنکنگ نظام چھوٹی چھوٹی بچتوں کو اس طرح یک جا
کرکے کام میں لاتا ہے کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے اقتصادی منصوبے پایہ تکمیل
کو جا پہونچتے ہیں۔ اس طرح بنک دو اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔

(۱) وہ لوگوں کی چھوٹی یا بڑی رقمیں جمع کرتے ہیں، اور
(۲) ان رقموں کو ایسے افراد کو قرض پر دے دیتے ہیں کہ جو انہیں پیداواری
کاموں پر صرف کر سکیں۔ پیداواری کاموں سے مراد ان کاموں سے ہے
جن کا نتیجہ ایسی اشیاء و خدمات کی پیدائش میں ہوتا ہے جو مستقبل کی
پیدائش دولت میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تو گویا بنکوں کی اہمیت موجودہ معاشرہ میں مسلم ہے۔ قائداعظم انتہائی دور
اندیش اور مدبر سیاستدان تھے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بات ان پر روز روشن
کی طرح عیاں تھی کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لئے ایک مضبوط بنک کی سخت
ضرورت ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہو۔ لہٰذا انہوں نے اس بات پر بے حد
اصرار کیا کہ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا بنک فوری طور پر قائم کیا جائے
انہوں نے فرمایا کہ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان

میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک بنک (حبیب بنک) مسلمانوں کا ہے جب کہ ملک میں سینکڑوں بنک سرگرم عمل ہیں جن کی ملکیت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے۔ قائداعظم کے مسلسل اصرار سے متاثر ہو کر مرحوم سر آدم جی داؤد اور مرزا احمد اصفہانی نے جن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں مسلم کمرشل بنک قائم کیا۔ تقسیم ہند کے بعد اس بنک کے دفاتر پاکستان منتقل کر دیئے گئے اور بہت جلد اس بنک نے اپنی شاخیں پاکستان کے اہم شہروں میں قائم کر دیں اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی سرگرمیوں میں یہ بنک انتہائی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

جدید ماہرین اقتصادیات نے پس اندازی کی دو قسمیں بنائی ہیں۔

(۱) بچت (Saving) اور (۲) زر کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding)

اگر ایک فرد کی ماہانہ آمدنی ۱۰۰ روپئے ہے جس میں سے وہ اسّی روپے اپنی ضروریات زندگی پر خرچ کرتا ہے تو اس کی ماہانہ بچت بیس روپے ہو گی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ اگر قومی آمدنی قومی اخراجات کے مقابلے میں زیادہ ہے تو نتیجہ قومی بچت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

اس بچائی ہوئی رقم کو افراد بنکوں میں جمع کرا سکتے ہیں یا بچت کی کسی اسکیم میں لگا سکتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بچت کہلاتی ہے۔ لیکن اگر لوگ بچائی ہوئی رقم کو اپنے پاس ہی رکھیں تو یہ صورت (Hoarding) کہلائیگی بچت کا تصور ذخیرہ اندوزی کے تصور سے اس لئے مختلف ہے کہ موخرالذکر تصور خالص نفسیاتی ہے جس میں فرد کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ دولت زر کی شکل میں جمع کرے اور اسے اپنے پاس ہی محفوظ رکھے۔

جب تک لوگ اپنی بچت بنکوں میں جمع کرائیں گے یا کسی بچت کی اسکیم میں

لگائیں گے اس وقت معیشت میں توازن برقرار رہے گا۔ لیکن جس وقت لوگوں میں زر کو ذخیرہ کرنے خواہش بڑھ جائے گی تو معیشت عدم توازن کا شکار ہوجائے گی کیونکہ کینز کی مساوات

بچت = سرمایہ کاری

غیر متوازن ہوگئی۔ ایسی صورت میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے معیشت میں یا تو افراط زر پیدا ہوجائے گا یا کساد بازاری پھیل جائے گی اور ہزاروں افراد و ملکی وسائل بے روزگار و بے اثر ہوجائیں گے جس سے معاشرہ میں بے شمار سماجی برائیاں پیدا ہوجائیں گی۔

اب بچت اور بینک کا تعلق قارئین پر واضح ہوگیا ہوگا اور انہیں یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ موجودہ معیشت میں بچت اور بنک ہماری اقتصادی زندگی کے لئے کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ بچت اور بنک آج کی دنیا میں دو ایسے الفاظ ہیں جن سے ہمارے معاشرے کا بچہ بچہ واقف ہوچکا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھئے، ریڈیو سنئے یا اخبارات کا مطالعہ کیجئے آپ کو ہر قدم پر ان دونوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۹۱۲ء میں جبکہ اقتصادی تعلیم محدود تھی کسے معلوم تھا کہ تیس چالیس سال کے بعد بچت اور بنک کس قدر اہمیت اختیار کر جائیں گے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے مستقبل میں جھانک لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف فضول خرچی سے باز رکھنے کی تلقین کی، نہ صرف پس اندازی کی ہدایت کی بلکہ صاحب حیثیت اور دولت مند مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے بنک قائم کریں وہ بنک جہاں کم حیثیت کے مسلمان اپنی چھوٹی چھوٹی بچائی ہوئی رقم محفوظ رکھ سکیں اور جہاں سے باصلاحیت مسلمان آجروں کو سرمایہ فراہم ہوسکے اور وہ صنعت کاری کے میدان میں ہندوؤں کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکیں۔

پاکستان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا۔ ہندو مجبور ہو گیا تھا کہ وہ برصغیر کی تقسیم کو قبول کرے لیکن وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ معاشی طور پر پاکستان کی زندگی چند روزہ ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ پاکستان کے خزانے خالی تھے۔ صنعت اور بنکنگ میں مسلمان ناتجربہ کار تھے۔ اس میدان میں گویا ایک خلا تھا جس کو تیزی کے ساتھ پر کرنا انتہائی ضروری تھا۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کو اس خلا کو پُر کرنے کے لئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بے شمار تھیں لیکن رفتہ رفتہ خدا کے فضل و کرم سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ آخر تو یہ مملکت خدا داد تھی جس کی حفاظت اللہ تعالےٰ نے فرمائی۔

میں سوچتا ہوں کہ کاش ۱۹۱۲ء میں چند ایک ہی ایسے اہل دل مسلمان ہوتے جو مولانا احمد رضا خاں کے ارشادات پر عمل کر لیتے تو مسلمانوں کی اقتصادی تاریخ برصغیر میں یقیناً مختلف ہوتی اور پاکستان کو انتہائی ناساعد معاشی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ایسی گہری سوچ اور ایسے نکات جن کے نتائج اس قدر دور رس ہوں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو صرف مردِ مومن کا کمال ہے۔ اس مردِ مومن نے تونگر مسلمانوں کو دعوت دی کہ مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا بنک قائم کرو تاکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت سنبھلے۔ یہی بات ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے دوہرائی۔ اگر ۱۹۱۲ء میں سر آدم جی اور مرزا اصفہانی جیسے دو چار سرمایہ دار فاضل بریلوی کی ہدایت پر عمل کر لیتے تو مسلمانوں کا معاشی مستقبل بہت کچھ سنور جاتا اور اس کے اقتصادی نتائج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بلکہ مسلمانانِ عالم کے لئے بے حد خوشگوار ثابت ہوتے۔

اب ہم مولانا احمد رضا خاں کے تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

(۳) "مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں"
ذرا اس نکتہ پر غور فرمائیے۔ موجودہ عالمی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ مسلمانوں نے اس عالم دین کے اس زرّیں اصول کو نہ تو سمجھا اور نہ ہی اس پر عمل کیا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی یورپ کے جنگ سے متاثر ہونے والے ممالک نے اس پر پورا پورا عمل کیا اور آج یہ ممالک اقتصادی طور پر دنیا کے مستحکم ترین ممالک سمجھے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں میں نے اپنے بچپن میں جب کہ دوسری جنگ عظیم زور شور سے جاری تھی اکثر مسلمانوں کی دوکانوں پر یہ شعر چسپاں دیکھا تھا ؎

زندگی عزت کی مسلم ہند میں چاہے اگر
تو یہ لازم ہے کہ سودا جب بھی لے مسلم سے لے

یہ غالباً فاضل بریلوی کے اس نکتے کی بازگشت تھی۔ اس شعر نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا، لیکن صاحب حیثیت مسلمانوں کو میں نے ہندوؤں کی دکانوں سے خرید و فروخت کرتے دیکھا۔ مسلمانوں میں اس وقت بھی ماہرین اقتصادیات موجود تھے، لیکن بدقسمتی سے ان کی نگاہیں مغربی مفکرین کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ خود ان کا ایک عالم اقتصادیات کے بارے میں کیسے کیسے موتی ان کے سامنے بکھیر گیا ہے۔ وہ اپنے خزانے سے بے خبر رہے لیکن مغربی خزانوں کی طرف حسرت و یاس سے دیکھتے رہے اور کسی نے بھی مولانا کے اس نکتہ پر غور نہیں کیا، نہ ہی اسے سمجھا اور نہ ہی وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ اگر اس وقت کوئی بھی مسلم ماہر اقتصادیات اس نکتے کے دوررس اثرات کی وضاحت کر دیتا اور مسلمان صرف مسلمانوں ہی سے خرید و فروخت کرنے لگتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان ہندوستان میں معاشی اعتبار سے دوسری قوموں کے

مقابلے میں پست ہوتے۔

معاشیات میں اس بات پر گرما گرم بحث ہوتی رہی ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے کہ بین الاقوامی تجارت آزاد ہونی چاہیئے یا اس پر پابندیاں ضروری ہیں۔ تامین (Protection) کے خلاف اور موافقت میں بڑے بڑے یورو پین اور امریکی ماہرین معاشیات نے دلائل پیش کئے ہیں۔ آدم اسمتھ کو (Adam Smith) جسے معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے آزاد بین الاقوامی تجارت کا سب سے بڑا حامی سمجھا جاتا ہے۔ آزاد عالمی تجارت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مملکتوں کے مابین اشیاء و خدمات کی آمد و رفت پر پابندیاں نہیں ہیں یا اگر ہیں بھی تو برائے نام۔ اس کے برخلاف تامین وہ تحفظ ہے جو حکومت ملکی صنعتوں کو غیر ملکی مقابلے سے بچانے کے لئے دیتی ہے۔ آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۷۹۱ء میں امریکہ کے ایک سیاستدان الیگزینڈر ہملٹن (Alexander Hamilton) نے تامین کی پالیسی کی پرزور حمایت کی اور آزاد بین الاقوامی تجارت کی مخالفت جرمنی میں فریڈرک لسٹ نے تامین کی حمایت میں پرزور دلائل دیئے۔ سب سے پرزور دلیل جو تامین کے حق میں دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی نوزائیدہ صنعتیں بیرونی مقابلے سے اس وجہ سے تحفظ کی مستحق ہیں کہ وہ مضبوط بیرونی صنعتوں کا اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں قطعاً مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ان کی حفاظت حکومت کا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قبل ہی بیرونی مقابلے کے سامنے دم توڑ دیں۔

ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تامین اس لئے ضروری ہے کہ ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی ہے اور روزگار میں اضافہ ہوتا ہے نیز یہ جذبۂ حب الوطنی

کے فروغ کا باعث ہے۔

اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو تابین کے حق میں دیئے گئے ہیں مگر میں صرف مندرجہ بالا دو دلائل کے متعلق مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تیسرے نکتے کی روشنی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے برصغیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں انگریزی حکومت ہندوستان میں انتہائی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس وقت کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف ۳۵ سال بعد فرنگی اس سرزمین کو چھوڑ کر بھاگ جائیگا۔

مسلمانوں کا اب اپنا کوئی ملک نہ تھا لیکن مسلم قوم اب بھی موجود تھی جسے اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ انہوں نے کیا گم کر دیا ہے۔ حکومت ختم ہو چکی تھی مگر قوم اب بھی موجود تھی، اس قوم کی سماجی، مذہبی اور معاشی بقا کے لئے معنوط بنیادوں پر اہل نظر اور اہل علم مسلمانوں کو پالیسیاں وضع کرنی تھیں۔ تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی میدان میں مسلم لیڈران سرگرم عمل تھے۔ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے جدو جہد تیز تر ہوتی جا رہی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر کسی نے بھی مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور اس سے نپٹنے کے لئے کوئی پالیسی وضع نہ کی۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے معاشی نکات پیش کئے جن پر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے کوئی غور و فکر نہیں کیا۔ تعلیم یافتہ مسلمان اپنی راہبری کے لئے مغربی علماء کا سہارا لے رہے تھے اور اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے درمیان ایک ایسے باوصف انسان کو بھیجا ہے کہ جس کے ارشادات پر اگر مسلمان عمل کرتے تو کب کے اپنی غربت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کر کے باعزت زندگی بسر کرنے لگتے۔

مولانا احمد رضا خاں کا تیسرا نکتہ میرے نزدیک معاشی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ وہ مسلمانوں کو معاشی تحفظ دینا چاہتے تھے۔ روزگار اور تجارت کے میدان میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ بنیوں کی ذہنیت اور فطرت ہی یہ تھی کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں کوئی تجربہ نہ تھا اور اگر مسلمان تجارت کرنا بھی چاہتے تو اول تو ہندو اپنے مقابلے میں انہیں میدان سے بھگا دیتے تھے اور دوسرے اپنوں کی بے اعتنائی ان کا دل توڑ دیتی تھی۔ فاضل بریلوی پر یہ باتیں روز روشن کی طرح عیاں تھیں۔ اس کا صرف ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ مسلمان مسلم تجارت پیشہ افراد کو تحفظ دیں اور خرید و فروخت صرف مسلمانوں ہی سے کریں۔ یعنی فاضل بریلوی نے جدید اقتصادی زبان میں مسلمان دوکانداروں کے لئے مسلمان بھائیوں سے تائید کی اپیل کی۔ مسلمان دوکانداروں کی مثال بالکل اس نوزائیدہ صنعت کی سی تھی جسے سخت ترین بیرونی مقابلے کا سامنا تھا اور ان کی بقا اسی صورت میں تھی کہ مسلمان ان کی سرپرستی کریں۔ یہاں کسی ملکی صنعت کو تحفظ نہیں دینا تھا بلکہ اپنی قوم کی اس جماعت کی حفاظت مقصود تھی جو معاشی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے کوشاں تھی۔

اب اگر مسلمانانِ ہند فاضل بریلوی کے ارشاد پر عمل کرتے تو اس کے اقتصادی نتائج کیا ہوتے؟ مسلمانوں کا پیسہ مسلمان دوکانداروں کے پاس جاتا۔ لپنے طور پر یہ مسلمان تاجر مسلمان تھوک فروشوں سے زیادہ سامان حاصل کرتے۔ مسلم تھوک فروش مسلم صنعت کاروں سے زائد اشیاء خریدتے اور جب موثر طلب میں اس طرح اضافہ ہوتا تو مسلمان صنعت کار زیادہ اشیاء پیدا کرتے کیونکہ ان کی اشیاء کی طلب میں اضافہ ہوتا۔ اشیاء کو پیدا کرنے کے لئے وسائل پیدائش کی ضرورت ہوتی ہے یعنی زمین، محنت اور سرمائے کی۔ مسلمان صنعت کار جب اشیاء

کی پیداوار میں اضافہ کرتے تو یقیناً وہ بے روزگار مسلمان جو تلاش روزگار میں سرگرداں تھے ملازمتیں حاصل کر لیتے اور جب ان افراد کی آمدنیوں میں اضافہ ہوتا تو ان کی موثر طلب بڑھ جاتی اور معاشیات کا وہ چکر شروع ہو جاتا جو کسی بھی معیشت کو خوشحال کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان صنعت کار سرمایہ کہاں سے لاتے تو اس کا جواب مولانا احمد رضا خاں کے پہلے دو نکات میں پوشیدہ ہے کہ مسلمان بچت کریں اور صاحب حیثیت مسلمان بینک قائم کریں۔ بینک جن کا اولین مقصد پیداواری کاموں کے لئے سرمایہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

کینز کے نظریہ" روزگار و آمدنی" میں موثر طلب (Effective Demand) بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تیسرے نکتہ میں موثر طلب کا خیال واضح طور پر موجود ہے۔ سارا کریڈٹ کینز کو جاتا ہے اور ہم اپنے عالم کے ارشادات سے قطعاً بے خبر مغربی ماہرین معاشیات کو داد دیتے رہتے ہیں۔ قسمت کی اس ستم ظریفی کو ہم کیا نام دیں گے۔ خوان نعمت ہمارے سامنے لگا ہوا ہے لیکن ہماری نگاہیں مغرب کی ڈنر ٹیبل پر لگی ہوئی ہیں۔

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ فاضل بریلوی کے اس نکتے پر مغربی دنیا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کتنا عمل کیا ہے۔ مغربی یورپ کے ممالک مثلاً جرمنی، فرانس اور اٹلی وغیرہ اس جنگ میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ خصوصاً جرمنی اور اٹلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جرمنی کی "بندر بانٹ" ہوئی۔ ایک حصہ روسیوں کے پاس اور دوسرا اتحادیوں کے قبضے میں آیا۔ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو کر مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی بن گیا۔ جرمنی کی اقتصادی و معاشی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ یہی حالت فرانس اور اٹلی کی تھی

لیکن جرمنی نے جلد ہی اپنی حالت کی اصلاح کی طرف توجہ دی ۔ وہاں کے دانشمندوں نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی کہ جرمنی کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اقتصادی بحالی فوقیت کے لحاظ سے اول نمبر پر ہے ۔ جنگ کی تباہی کے بعد مغربی جرمنی تنہا اپنی معیشت کو بحال نہیں کر سکتا تھا ۔ لہذا روم میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یورو پین مشترکہ منڈی (European Common Market)

کا قیام عمل میں آیا جو چھ مغربی یورپی ممالک پر مشتمل تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عالمی سیاست میں امریکہ کا طوطی بول رہا تھا اور عالمی معیشت میں امریکی ڈالر کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا ۔

اس منڈی کے قیام کے پس پشت جو نظریہ کارفرما تھا وہ بعینہٖ وہی تھا جس کی ہدایت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے تیسرے نکتے میں فرمائی تھی یعنی مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں ۔ معاہدہ روم جس کے تحت اس منڈی کا قیام عمل میں آیا تھا ، ان شرائط و ضوابط پر مشتمل تھا کہ منڈی کے اراکین ان اشیاء کو پیدا کریں گے جن کی پیدائش پر انہیں دوسرے ممالک پر فوقیت حاصل ہے ۔ منڈی کے اراکین ممالک خود کو ایک وحدت خیال کریں گے ۔ آپس میں تجارت آزادانہ ہوگی یعنی تجارت پر کوئی پابندی نہ ہوگی ، وسائل پیدائش کی منتقلی پر پابندیاں نہ ہوں گی درآمدات پر بھاری ٹیکس لگائے جائیں گے اور برآمدات رعایتوں کی مستحق ہونگیں ۔ جو اشیاء منڈی کے اراکین پیدا کر سکتے ہیں ، انہیں باہر سے نہیں منگوایا جائیگا زیادہ سے زیادہ خرید و فروخت آپس ہی میں ہوگی ۔

منڈی کے قیام کے وقت غالباً اراکین کو بھی اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ یہ ادارہ انتہائی مستحکم اقتصادی ادارہ بن گیا ۔ منڈی کے اراکین کی معیشت انتہائی مضبوط خطوط پر قائم ہوئی ۔ مالی اعتبار سے اراکین کی حیثیت بے حد مضبوط ہو گئی اور ہم نے دیکھا

کہ عالمی اقتصادیات میں امریکن ڈالر کی حیثیت ثانوی رہ گئی اور جرمن مارک دنیا کی مضبوط ترین کرنسی بن گیا۔

یوروپین مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی نے معاشیات کی ایک نئی شاخ کو جنم دیا جسے ہم (Theory of Economic Integration) کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔

مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی سے متاثر ہوکر یورپ کے تقریباً دس ممالک نے جس میں برطانیہ بھی شامل تھا ایک یوروپین فری ٹریڈ ایریا (European Free Trade Area) قائم کرلیا لیکن وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جو یوروپین مشترکہ منڈی کو ہوئی۔ پاکستان ایران اور ترکی کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا جسے ہم آر۔ سی۔ ڈی کے نام سے جانتے ہیں۔ انہیں خطوط پر تھا لیکن اس ادارہ کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوسکی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ آر۔ سی۔ ڈی کو کامیاب بنانے کے لئے تینوں ممالک کے سربراہوں کی ایک کانفرنس ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء کو ازمیر (ترکی) میں منعقد ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اگر تینوں ممالک صدق دل اور نیک نیتی سے اس ادارے کی کامیابی کے لئے کوشش کریں تو کامیابی نصیب نہ ہو۔

بہرحال اس تمام بحث سے غرض یہ تھی کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے جو نکتہ بیان فرمایا تھا اگر مسلمان صدق دل سے اس پر عمل کرتے تو وہ نہیں بھی یقیناً وہی کامیابی ملتی جو یوروپین مشترکہ منڈی کے حصے میں آئی۔ ہمارے ایک عظیم عالم دین نے ہمارے لئے چراغ جلاکر رکھدیا تھا جس کی روشنی میں ہمیں صحیح راستے کا تعین کرنا تھا لیکن افسوس راستے کا تعین تو درکنار ہم نے اس شمع ہدایت کو بھی نظرانداز کردیا۔ اسے ہم صرف اپنی بدنصیبی اور کوتاہ بینی سے

خیبر کر سکتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی اصطلاحات میں راہبرانِ ملت ایسے الجھے کہ انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی جو یقیناً حیرت انگیز اور قابلِ افسوس امر ہے جب کہ ان کی ہدایت کے لئے اتنے واضح نکات مولانا احمد رضا خاں نے ۱۹۱۲ء میں وضع فرمادیئے تھے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا چوتھا نکتہ[1] گو کہ اقتصادیات کے متعلق نہیں لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

(۴) "علم دین کی ترویج و اشاعت کریں"

یہ وہ زمانہ تھا کہ سر سید کی تعلیمی اصلاحات کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا حصول بذاتِ خود ایک اچھی بات تھی۔ مسلمانوں کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن جو بات تشویشناک تھی اور جسے مولانا کی ذاتِ گرامی نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل مغربی تہذیب کی بھی دلدادہ ہوتی جا رہی تھی یعنی کوا ہنس کی چال اختیار کر رہا تھا جو کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ فاضل بریلوی نے سمجھ لیا تھا کہ اگر مسلمان علم دین سے بے بہرہ ہو گئے تو وہ اپنی حیثیت و انفرادیت کو گم کر بیٹھیں گے۔ نئی تہذیب ان کی وحدت کو ختم کر دے گی اور ان کا وہی حال ہو گا کہ ؏

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

---

[1] یہ نقطہ بھی اس لحاظ سے اقتصادیات سے متعلق ہے کہ پہلے تین نکات پر عمل کا جذبہ قومی اور ملی تصلّب سے پیدا ہوتا اور قومی تصلّب و عصبیت کے لئے دینی تعلیم ضروری ہے تو بالواسطہ یہ آخری نکتہ بھی اقتصادیاتِ اسلامی سے متعلق ہے۔ (ادارہ)

اکبر الٰہ آبادی نے بھی یہ بات بخوبی محسوس کر لی تھی اپنی شاعری کے تیز و تند نشتروں سے انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے کا احساس دلایا، انہیں سمجھایا کہ اپنی اصلیت مت بھولو تمہارا سب سے بڑا خزانہ تمہارا مذہب اور تمہاری تہذیب ہے۔ لیکن "رفارم" کا چکر اتنا تیز تھا کہ مسلمان اس طرف متوجہ نہ ہوئے اور اکبر الٰہ آبادی نے فرمایا کہ ؎

سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے رہے پیسہ نہ ملا

اور یہ کہ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جاکے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مغربی تہذیب نے ایسا رنگ جمایا اور نوجوانوں کو اپنی رنگینیوں کا ایسا متوالا بنایا کہ وہ اپنے معاشرے، تہذیب اور مذہب سے دور ہوتے چلے گئے اور فرنگی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے گئے۔

مذہب سے بیگانگی برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو بے حد نقصان پہنچایا۔ لیکن جب قائداعظم محمد علی جناح نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہا تو مسلمان پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اسلامی غیرت و حمیت اس وقت بھی مسلمانانِ ہند میں موجود تھی جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مسلمانوں کو ایک نیا ملک نصیب ہوا جو اس بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی ثقافت و تہذیب ہندوؤں سے مختلف ہے۔ مگر بد نصیبی تو ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام کے نام پر علیحدہ مملکت تو وجود

ہیں آگئی مگر ترویج دین کی طرف اہل اقتدار نے کوئی توجہ نہ دی ۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مملکت اسلامیہ پاکستان کو صحیح طور پر ایک اسلامی ملک بنایا جاتا ۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت ہوتی ۔ نوجوانوں کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرایا جاتا ۔ انہیں بتایا جاتا کہ پاکستان کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے کس لئے جدوجہد کی تھی اور بے شمار قربانیاں کیوں دی گئیں تھیں ۔ لیکن افسوس کہ اس طرف سے توجہ ہٹالی گئی ۔ اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہو گئی ۔ ابھی ملک کی جڑیں مضبوط بھی نہ ہوئی تھیں کہ طوفان حوادث نے اسے آگھیرا ۔ مذہب سے بیگانگی نے اور بھی غضب ڈھایا ۔ ہم نے خود کو صوبوں سے خصوصیت دے لی اور یہ بھول گئے کہ ہم اول و آخر صرف مسلمان ہیں ۔

ہمارے ملک پر جو آفات نازل ہوئیں ان کا بنیادی سبب ہماری مذہب سے بیگانگی تھا ۔ اگر ابتدا ہی سے علم دین کی ترویج و اشاعت پر زور دیا جاتا تو ہمیں یہ بُرے دن ہرگز نہ دیکھنا پڑتے ۔

آج ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہماری نئی نسل کو جو مغرب کی تقلید میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے ۔ اسلامی تعلیم ، اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے ۔ اگر اس سلسلہ میں نیک نیتی سے کوششیں شروع کر دی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری نسل اپنی منزل کو نہ پالے ۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ؒ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

BIBLIOGRAPHY

(1) CROWTHER, G :- *"An outline of Money"*

(2) **DEWETT, K.K** :- *"Modern Economic Theory"* Premier Publishing Co. New Dehli, 1975.

(3) ISPAHANI, **A H** :- *" I Remember "* Published in **Quaid e-Azam** as seen by **his contemporaries**, compiled by Jamil-ud-Din Ahmed, Publishers United Ltd Lahore 1966.

(4) **KEYNES**, J.M :- *"General Theory of Employment, Interest and Money"* Harcourt, **New** York

(5) **KLEEN, L R** :- *"The Keynesian Revolution"* Macmillan, New York, 1947

(6) **KURTHARA, K K** :- *"Monetary Theory and Public Policy"* Allen & Unwin London, 7th Impression, 1967.

(7) **NURKSE, R** :- *" Problems of Capital Formation in Under development Countries "*.

یوم رضا

مرکزی مجلس رضا، لاہور — اعلیٰ حضرت امام اهل سنت
شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ کی علمی، دینی اور ملی
خدمات جلیلہ کے تعارف کے لئے کتب و رسائل شائع کرنے کے ساتھ ساتھ
ہر سال آپ کے یوم وصال (عرس مبارک) کے موقع پر جلسہ ,, یوم رضا ،،
کا انعقاد کرتی ہے، جس میں ملک کے نامور علماء، فضلاء اور دانشور
حضرات امام اہل سنت کے عظیم علمی کارناموں اور بے مثال دینی
خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ روح پرور تقریب "جامع مسجد نوری"
بالمقابل ریلوے اسٹیشن۔ لاہور، منعقد ہوتی ہے۔

ازیں علاوہ ,, مرکزی مجلس رضا ،، لاہور کی طرف سے، ملک
کے گوشے گوشے میں جلسہ ہائے یوم رضا منعقد کرنے کی اپیل کی
جاتی ہے — اس تحریک سے ملک کے اکثر مقامات پر یوم رضا منایا
جانے لگا ہے، مگر ہم اس میں مزید وسعت کے خواہاں ہیں۔ لہذا علماء
کرام اور اہل سنت کی انجمنوں سے اپیل ہے کہ وہ یوم رضا کو وسیع
پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا کریں۔

اراکین : مرکزی مجلس رضا — لاہور